اِسلام اور تہذیبِ مغرب میں انسانی مساوات کی حقیقت

از مصطفیٰ سباعی پرنسپل شریعت کالج، شام

اسلامی تہذیب اپنے دامن میں جو فضائل و مکارم رکھتی ہے ان میں سے ایک انسانی مساوات ہے، جو دراصل اسلام کی آفاقیت اور انسان دوستی (HUMANISM) کا مظہر اور انسانوں کے اندر رنگ و نسل سے قطع نظر ایک حقیقی وحدت و یگانگت پیدا کرنے کی دعوت ہے۔ قرآن کا یہ بیان کہ "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللہِ اَتْقَاکُمْ" اسی مساواتِ عامہ کا اعلان ہے، جس نے بنی نوع انسان کے تمام مادی و حسی امتیازات پر خطِ تنسیخ پھیر کر صرف تقویٰ اور خدا ترسی کو وجہِ امتیاز اور معیارِ فضیلت قرار دیا ہے۔ اسی اعلان کی مزید وضاحت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے حجۃ الوداع کے موقع پر جمِ غفیر کے سامنے کھڑے ہو کر فرمائی:

الناس من اٰدم واٰدم من تراب لافضل لعربی علی عجمی ولا لابیض علی اسود الا بالتقویٰ۔	تمام انسان آدم کی اولاد ہیں۔ اور آدم مٹی سے بنے تھے پس کسی عربی کو عجمی پر اور کسی گورے کو کالے پر فضیلت نہیں فضیلت صرف تقویٰ اور پرہیزگاری کی بنا پر ہے

اسلامی تہذیب میں انسانی مساوات کے مظاہر اسلامی تہذیب کا یہ نظریہ مساوات محض خوشنما الفاظ اور اصولوں کی حد تک نہ تھا کہ گاہے گاہے ملکی و غیر ملکی تقریبات میں ان کے اظہار سے لذتِ تقریر حاصل کر لی جایا کرے، جیسا کہ تہذیبِ جدید کے علمبرداروں کا شیوہ ہے، بلکہ اسلامی معاشرے میں یہ مساوات اپنی پوری شان کے ساتھ عملاً جلوہ گر تھی اور اسلامی معاشرے کے لیے یہ کوئی ایسی اجنبی اور غیر معمولی چیز نہ تھی جس کے نفاذ کے لیے محنت و مشقت اٹھانی پڑی ہو۔ چنانچہ اسلام نے تمام اجتماعی مواقع پر اس مساوات کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ مساجد میں اس

مساوات کو نافذ کیا ہے۔ جہاں ایک ہی صف میں کالے اور گورے کھڑے ہو کر اپنے خالق کی بندگی کرتے ہیں اور انکساری و سرافگندگی سے اپنے ہیچ میرز ہونے کا اقرار کرتے ہیں، اور کوئی گورا کالے کے پہلو میں کھڑا ہونے سے انقباض یا اپنی توہین و تذلیل محسوس نہیں کرتا۔ حج میں اس کو نافذ کیا ہے جہاں ہر رنگ اور ہر نسل کے انسان دوش بدوش مناسکِ حج ادا کرتے ہیں اور بلا امتیازِ ابیض و اسود ایک ہی نوع کے لباس میں ملبوس ہو کر اپنے عجز و ضعف کا اعتراف کرتے ہیں۔

تاریخ اسلامی میں مساوات کی حیرت انگیز شہادت | اسلامی تاریخ میں انسانوں کے اندر رنگ و نسل کی تفریق کو مٹانے کی اس سے بڑھ کر حیرت انگیز شہادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ فتح مکہ کے دن پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے افریقہ کے ایک سیاہ فام باشندے ــ بلالؓ ــ کو حکم دیا کہ وہ خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اسلام کے غلبہ کا اعلان کریں۔ غور کیجیے کعبہ وہ مقام ہے جو دورِ جاہلیت میں بھی عربوں کی نگاہوں میں حرم مقدس تھا اور اسلام میں بھی اُسے قبلہ مسلمین ہونے کا شرف حاصل ہے، اُس کی چھت پر سیاہ فام باشندہ کیونکر چڑھ سکتا ہے اور کیونکر اُسے اپنے قدموں کے نیچے روند سکتا ہے، بے شک تہذیبِ مغرب اس کا تصور کرنے سے بھی قاصر ہے، لیکن اسلامی تہذیب آج سے چودہ سو برس قبل مساواتِ انسانی کا یہ عملی مظاہرہ کر چکی ہے۔ بامِ کعبہ پر حضرت بلال کا چڑھنا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ انسان ــ خواہ کالا ہو یا گورا ــ ہر چیز پر شرف اور برتری رکھتا ہے اور وہ اس شرف اور برتری کا مستحق نسل و نسب اور رنگ و قوم سے نہیں بلکہ علم و عقل اور اخلاق و ایمان کی بدولت ہو سکتا ہے۔ انسان اگر اعمال و اخلاق میں پسماندہ ہے تو جلد کی سفیدی اُسے فوقیت نہیں دے سکتی اور اگر اُسے بصیرت و عرفان اور اعمالِ صالحہ میں برتری حاصل ہے تو اُسے جسم کی سیاہی فروتر نہیں کر سکتی۔ ایک بار ایک جلیل القدر صحابی حضرت ابوذرؓ نے حضرت بلالؓ کو یا ابن السوداء (اے کالی ماں کے بیٹے!) کہہ کر پکارا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کا علم ہوا تو اس انداز کو سخت ناپسند کیا بلکہ آپ نے حضرت ابوذرؓ کو جھڑکا اور فرمایا: اعیرته بسواد امه انك امرؤ فيك جاهلية (کیا تم بلالؓ کو ماں کے کالی ہونے کا کوسنا دیتے ہو۔ تمہارے اندر تو ابھی جاہلیت کا اثر باقی ہے)۔

جاہلی تہذیب اور اسلامی تہذیب کے مابین یہی خطِ فاصل ہے۔ جاہلی تہذیب جس رنگ پرستی اور نسب و نسل کو اپنے لیے فخر و ناز کا سرمایہ اور علم و دانش کا پیمانہ قرار دیتی ہے۔ اسلامی تہذیب میں وہ سراسر جاہلیت اور نادانی ہے۔

جس تہذیب کی شان یہ ہو کہ اس میں کسی نسب کو دوسرے نسب پر اور کسی رنگ کو دوسرے رنگ پر استبداد و تفوق کی اجازت نہ ہو بلاشبہ اس تہذیب کی گود انسانیت کے لیے موجبِ سعادت ہوگی، لیکن جس تہذیب کے گہوارے میں گورا تو ہر طرح کے تسلط و تغلب کا مجاز ہو لیکن کالے کے نصیب میں بجز ذلت و رسوائی کچھ نہ ہو۔ ساری سعادتیں اور منفعتیں سفید جلد نے اپنے لیے مختص کر لی ہوں اور شقاوتوں اور صعوبتوں کا سارا طومار سیاہ جلد کے گلے میں منڈھ دیا گیا ہو وہ تہذیب اپنی رنگا رنگ تزئینوں اور ظاہری چمک دمک کے باوجود جاہلیت کی تاریک وادی میں بھٹک رہی ہے اور انسانیت کو صدیوں پیچھے دلدل میں پھینک رہی ہے جہاں کورچشمی، بے جا فخر و غرور اور جہالت و حماقت کے سوا کچھ نہیں مگر اسلامی تہذیب نے قدم قدم پر اس طرح کی نسلی و لونی تفریقوں کی بیخ کنی کی ہے اور اپنی عبادت گاہوں میں تعلیمی اداروں میں، سیاسی و معاشی میدانوں میں، عدالت و قیادت کے منصبوں میں حتیٰ کہ دشمن کی دشمنی اور دوست کی دوستی تک میں نسل پرستی کا اکل کھرا پن ختم کیا ہے۔

سیاہ فام اور منصبِ قیادت حضرت عمرو بن العاص کی زیر سرکردگی جب اسلامی فوجیں مصر میں داخل ہوئیں اور قلعہ بابلیون کے سامنے انہوں نے خیمے نصب کیے تو مصر کے بادشاہ مقوقس نے صورتِ حال کو دیکھ کر اسلامی فوجوں سے گفتگو کی خواہش کی اور اپنی طرف سے مسلمانوں کے پاس ایک وفد بھیجا اور مسلمانوں سے بھی مطالبہ کیا کہ وہ بھی اپنا ایک وفد اس کے پاس بھیجیں۔ چنانچہ حضرت عمرو بن العاص نے دس افراد پر مشتمل ایک وفد شاہِ مصر کی جانب روانہ کیا۔ وفد میں حضرت عبادہ بن صامت بھی تھے جن کا رنگ انتہائی کالا تھا۔ اور قد میں بھی خاصے لمبے تھے حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ ان کا قد دس بالشت کے قریب تھا۔ حضرت عمرو بن العاص نے حکم دیا کہ وفد کی طرف سے تمام بات چیت وہی کریں۔ جب یہ وفد مقوقس کے دربار میں پہنچا اور حضرت عبادہ بن صامت گفتگو کے لیے آگے بڑھے

تو مقوقس ان کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا اور کہنے لگا: اس کالے شخص کو میرے سامنے سے ہٹا دو اور کسی دوسرے کو گفتگو کے لیے آگے کرو۔ مقوقس کے ان الفاظ پر تمام لوگ کھڑے ہو گئے اور یک زبان ہو کر بولے: "یہ کالا شخص ہمارا سردار ہے، علم و عقل میں ہم سب سے افضل ہے۔ ہم سب اس کے حکم کے تابع اور اس کی رائے کے پابند ہیں۔ امیر سپاہ نے ہم سب کو چھوڑ کر اسے ہمارا قائد بنایا ہے اور ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم اس کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کریں۔ مقوقس نے جواب دیا: اس اسود کو اپنا سردار ماننے پر تم کیسے راضی ہو گئے ہو، حالانکہ اسے تم سب سے کم تر ہونا چاہیے۔ ارکانِ وفد نے فوراً کہا: یہ خیال غلط ہے۔ اگرچہ یہ شخص تیری نظروں میں سیاہ ہے، لیکن مرتبہ و مقام میں، سبقتِ اسلام میں اور عقل و تدبر میں ہم میں سے کوئی اس کا ہم پلہ نہیں ہے۔ باقی رہی جسم کی سیاہی تو وہ ہمارے مسلک میں کوئی قابلِ اعتراض اور معیوب چیز نہیں۔" بالآخر شاہ مقوقس نے حضرت عبادہؓ سے کہا: اے اسود! تو ہی آگے بڑھ کر مجھ سے گفتگو کر۔ یہ گفتگو نرمی کے ساتھ ہو کیونکہ تیری سیاہی سے میرا دل دہل رہا ہے۔ اگر تو نے تندی سے کام لیا تو میرا ہراس مزید بڑھ جائے گا۔ حضرت عبادہ نے مقوقس کی گھبراہٹ کو دیکھ کر فرمایا: "ہماری فوج میں ایک ہزار کالے سپاہی ہیں اور اُن میں سے ہر ایک مجھ سے زیادہ کالا ہے۔"

قدیم دورِ جاہلیت کا غیر مہذب انسان --- اور بیسویں صدی کا مہذب انسان بھی --- بشرے کی سیاہی کو ایک عیب خیال کرتا تھا۔ وہ کالے رنگ کے انسان کو یہ حق دینے کے لیے بھی تیار نہیں تھا کہ وہ سفید رنگ والوں کی صف میں رکھا جائے۔ کجا یہ کہ وہ ان کا قائد اور پیشوا ہو۔ اور علم و تدبر میں اُن سے افضل گردانا جائے۔ لیکن اسلامی تہذیب کے جسم نے غیر عقلی امتیازات کے یہ تمام پیمانے چکنا چور کر دیئے اور انسانی تفریق کے نظریے کو جہالت و حماقت قرار دیا۔ اور اس بات کی کھلی چھٹی دے دی کہ اگر کوئی سیاہ فام علم و فکر میں، شجاعت و بسالت میں اور ایمان و اخلاق میں فوقیت رکھتا ہے تو وہ اونچے سے اونچے منصب تک پہنچ سکتا ہے۔ ہم نے حضرت عبادہ بن صامتؓ کو صرف مثال کے طور پر پیش کیا ہے، ورنہ اسلامی تاریخ کا ہر باب اس قسم کی

مثالوں سے بھرا پڑا ہے، اور ہمیں ایسے سیاہ فاموں کی طویل فہرست ملتی ہے جن کو اسلامی تہذیب نے ملّت کا ہیرو قرار دیا ہے۔

سیاہ فام مسندِ افتا پر اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان زمانۂ حج میں اعلان کروایا کرتا تھا کہ امام اہلِ مکّہ عطا بن ابی رباح کے علاوہ کوئی شخص فتویٰ نہ دے۔ یہ عطاء بن ابی رباح اہلِ مکّہ کے مرجع و پیشوا شکل و صورت کے لحاظ سے کیسے تھے؟ اس کی تفصیل حافظ ذہبی مصنّف تذکرۃ الحفّاظ کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:۔

"عطاء سیاہ فام، یک چشم، چپٹی ناک والے، ایک ہاتھ سے معذور اور اپاہج تھے۔ بال گھنگھریلے تھے۔ دیکھنے والے کو ان کے چہرے سے علم و فضل کی کوئی علامت نظر نہ آتی۔ جب وہ اپنے حلقۂ درس میں ہزاروں تلامذہ کے درمیان تشریف فرما ہوتے تو معلوم ہوتا کہ گویا روئی کے کھیت میں کوا بیٹھا ہے"

لیکن اسی عطاؒ کو اسلامی تاریخ نے ملّت کی امامت و مرجعیت کے مسند پر سرفراز کیا ہے۔ اور ان کے ہاتھوں سے ہزاروں سفید رنگ والے علم و فضیلت سے بہرہ مند ہوئے ہیں جن میں سے ہر ایک تاریخ کا درخشندہ ستارہ شمار ہوتا ہے۔

سیاہ فام فقہاء و علماء فقہ حنفی کی مشہور کتاب کنز الدقائق کے شارح عثمان بن علی زیلعی اور نصب الرایہ کے مؤلف حافظ جمال الدین ابو محمد عبداللہ بن یوسف زیلعی (ف ۷۶۲ھ) دونوں عالم سیاہ رنگ تھے اور حبشہ کے ایک شہر زیلع کے باشندے تھے۔ مگر آج تک مسلمان ان کو اس حیثیت سے تو جانتے ہیں کہ ان کی تالیفات فقہ حنفی کی کتب مآخذ میں شمار ہوتی ہیں۔ لیکن ان کا کیا نسب تھا، کیسا رنگ تھا، کس قوم سے تعلق رکھتے تھے؟ ان باتوں کی طرف کسی نے دھیان نہیں دیا اور نہ ہی اسلامی تہذیب کا پیدا کردہ ذوق ان چیزوں کو اہمیت دیتا ہے۔

شعراء و ادباء کی ایسی معتدبہ تعداد ہمیں ملتی ہے جو حبشی تھے مگر خلفاء اور وزراء کے مصاحب رہے ہیں۔ کافور اخشیدی سے کون ناواقف ہے۔ یہ ایک سیاہ فام غلام تھا۔ اس نے چوتھی صدی ہجری میں مصر کی اسلامی سلطنت پر حکمرانی کی ہے۔ عربی کا مشہور شاعر متنبی اس کے دربار سے وابستہ رہا ہے اور

اس نے اپنی ہجو و مدح سے کافور کو تاریخ میں شہرتِ دوام بخشی ہے۔

مختصر یہ کہ اسلامی تہذیب کا مزاج اسود و احمر کی کوئی حد بندیوں سے قطعاً نا آشنا ہے۔ اس تہذیب کی تاریخ میں کوئی ایسا سیاہ باب نہیں ملتا جس سے یہ ثبوت فراہم ہوتا ہو کہ مسلم آبادیوں میں سیاہ فام نسل کی مخصوص بستیاں اور مخصوص سوسائٹیاں تھیں جن میں سفید فام داخل ہونا یا سکونت پذیر ہونا اپنی ناک کٹ جانے کے مترادف سمجھتے تھے۔ نہ ہی اس تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ دستیاب ہوتا ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے کہ گورے کالوں کو حقارت و استخفاف کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور بر بنائے رنگ اُن کو اپنے غیظ و غضب اور سیاسی تشدد کا نشانہ بنائے رکھتے تھے۔ اس کے علی الرغم تاریخ اسلامی کا ایک ایک لفظ گواہی دیتا ہے کہ جس تہذیب کی یہ تاریخ ہے وہ آفاقی اور انسانی تہذیب ہے۔ ابنائے بشر کو نسل و رنگ اور قوم و وطن کی عینک سے دیکھنے کے بجائے انہیں حق اور خیر کی میزان سے تولتی ہے اور انہیں ایک ہی باپ کی اولاد تصور کرتی ہے۔ سیاہی اور سپیدی اس کی نگاہ میں اگر کوئی وزن رکھتی ہے تو وہ انسانی جلد کی سیاہی و سپیدی نہیں بلکہ اعمال کی سیاہی اور سپیدی ہے اور اس کا اٹل اصول ہے کہ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔

مغرب کا تضادِ قول و عمل | تقریباً نصف صدی سے گورے اور کالے کی تفریق کے مسئلے پر بحث کا بازار گرم ہے۔ حالانکہ یہ بدیہی امر ہے کہ سیاہ و سفید کی تفریق سخت وحشیانہ فعل ہے۔ اسے کوئی ترقی یافتہ تہذیب اختیار نہیں کر سکتی اور یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ اسلامی تہذیب جو بنی نوع انسان کے اندر اخوت و مساوات قائم کرنے میں تمام انسانی تہذیبوں سے ممتاز اور شہرت یافتہ ہے، کوئی امتیازات کو ہرگز جائز اور صحیح نہیں قرار دے سکتی۔ لیکن جب سے اقوامِ متحدہ کا قیام عمل میں آیا ہے اور انسانی حقوق کے چارٹر کا اعلان ہوا ہے۔ تاریخ کی اس پیش پا افتادہ حقیقت پر گفتگو کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ کیونکہ حقوقِ انسانی کے اعلانات کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا کے مختلف حصوں میں ان حقوق کی سخت پامالی ہو رہی ہے۔ مثلاً دنیا دیکھ رہی ہے کہ جنوبی افریقہ

میں امتیاز رنگ کے تصور نے انسانی خون کی ندیاں بہا دی ہیں اور ابھی سلسلہ جاری ہے، کینیا کی آبادیوں میں استعمار دل گداز جرائم سلب و نہب کا ارتکاب کر رہا ہے۔ امریکہ میں حبشی اور ریڈ انڈین لونی تفریق کی بنا پر سیاسی و اقتصادی تشدد کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ لیکن آپ کو یہ معلوم کر کے سخت حیرت ہوگی کہ یہ کارنامہ مشرق کے لوگوں کا نہیں کہ ان پر رجعت پسندی، وحشت اور پسماندگی کا اتہام لگایا جا سکے جیسا کہ بالعموم اہل مغرب مشرقی دنیا پر اس طرح کے اتہامات کی بارش برساتے رہتے ہیں۔ بلکہ یہ انہی ترقی یافتہ اور مہذب و متمدن ممالک کا کارنامہ ہے جو حقوق انسانی کا اعلان کرنے والی انجمن کے سب سے اہم اور بااثر رکن ہیں۔ مثلاً امریکہ ہے جسے اقوام متحدہ پر غیر معمولی اثر و نفوذ حاصل ہے۔ انگلستان ہے جسے یورپ کی سب سے بڑی سلطنت ہونے کا فخر حاصل ہے اور اپنی ڈیموکریسی پر بڑا ناز ہے جنوبی افریقہ بھی اپنے یورپین فرمانرواؤں کی بدولت اقوام متحدہ کا نمائندہ ہے اور وہی فرمانروا ہی اس کے اوپر تسلط جمائے ہوئے ہیں اور اس کی نمائندگی کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ جنوبی امریکہ کی ریاستوں کو بھی اقوام متحدہ کے حلقوں میں مؤثر مرتبہ و مقام حاصل ہے۔ یہی وہ حکومتیں ہیں جو بڑی بے حیائی کے ساتھ بیسویں صدی میں انسانی دنیا پر ایسے شرمناک مظالم توڑ رہی ہیں کہ انسانی تاریخ نے انسان پر انسان کے تشدد و جبر کے ایسے شرمناک مظالم اپنے کسی دور میں بھی مشاہدہ نہیں کیے۔

افریقہ میں سفید فام نسل کی ستم رانیاں باوجودیکہ اقوام متحدہ کا افریشیائی گروپ اقوام متحدہ کے گذشتہ اجلاسوں میں رنگ کی بنا پر سفید فام و سیاہ فام کے حقوق و مراعات میں تفریق کے خلاف سخت احتجاج کر چکا ہے، لیکن جنوبی افریقہ کے حکام تاہنوز ان احتجاجات کو پرکاہ کی حیثیت نہیں دے رہے ہیں اور متواتر اپنی وحشیانہ سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں، اسی طرح انگلستان کینیا میں ماؤ ماؤ کی آزادی پسند تحریک کو کچلنے کے لیے مسلسل قومی کشت و خون پر تُلا ہوا ہے۔ بلکہ ابھی تک اپنے اُس اراضی ایکٹ سے بھی دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں جو ۱۹۱۵ء سے کینیا میں نافذ ہے اور جس کی رُو سے ۲۹ ہزار یورپین آبادکاروں کو اراضی پر وہ حقوق حاصل ہیں جو افریقہ کی اصل آبادی کی ۵۴ لاکھ ۵۵ ہزار کی تعداد کو حاصل نہیں ہیں، اور وہ اپنی ہی زمینوں پر لاوارث اور اپنے ہی وطن میں

بے وطن ہو کر ماری ماری پھر رہی ہے۔ سر الیوٹ، جو کینیا میں پہلا انگریز ہائی کمشنر تھا اور ۱۹۰۰ء میں اس کا تقرر ہوا تھا، کینیا میں اپنی حکومت کی پالیسی واضح کرتے ہوئے لکھتا ہے: "مستعمرہ کینیا کا تمام اندرونی حصہ سفید انسان کی سرزمین ہے۔ اس امر کا اعتراف نہ کرنا منافقت ہوگا کہ سفید فام باشندوں کی مصلحتوں اور بہبودیوں کو بہر حال ترجیح اور غلبہ حاصل ہونا چاہیے۔ ہم آئندہ جو پالیسی اختیار کریں یا جو قانون سازی عمل میں لائیں اُس کا بنیادی مطمحِ نظر یہ ہونا چاہیے کہ ہم اس ملک کو سفید فام کالونی میں تبدیل کر دیں" یہ پالیسی آج تک کینیا کے انگریز حکام کے مدنظر چلی آرہی ہے۔ اور وہ اس امر کی انتہائی کوشش کرتے چلے آرہے ہیں کہ سرزمینِ کینیا کا چپہ چپہ گوروں کے تصرف میں ہونا چاہیے اور وہ اس کی پیداوار کو جس طرح چاہیں استعمال کر سکیں۔

اراضی ایکٹ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہ گورنر کو اس امر کی مکمل اجازت دیتا ہے کہ وہ جسے چاہے زمین کا مالک ٹھہرا دے۔ اور جس قطعۂ زمین کا رقبہ ۵ ہزار ایکڑ سے زائد نہ ہو گورنر صاحب کو اختیار ہے کہ وہ کسی بھی شخص کو معمولی کرایہ پر ۹۹۹ سال تک کے لیے دے سکتا ہے۔ اسی پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ نفاذِ قانون کے بعد دس سال کے اندر اندر یعنی ۱۹۲۵ء تک یہ حالت ہو گئی کہ ایک سفید فام کے پاس اراضی کی اوسط مقدار ۰۰ ۵ ایکڑ تھی جبکہ وہاں کے رہنے والے افریقی کے پاس اراضی کی اوسط مقدار صرف ۸ ایکڑ تھی۔ اسی طرح سیاہ فام اہلِ وطن کو سفید فام آباد کاروں سے جُدا رکھنے کے سلسلے میں جو پالیسی اختیار کی گئی اُس کی صورت یہ تھی کہ سیاہ فام انسانوں کو مخصوص آبادیوں میں محصور کر دیا گیا جہاں سے انہیں متجاوز ہونے کی اجازت نہ تھی۔ جب گورے آباد کاروں کو کاشتکاری کے لیے کالے مزدوروں کی ضرورت پیش آتی — کیونکہ کالے مزدور انہیں انتہائی کم اُجرتوں پر مہیا ہو جاتے تھے — تو ان مزدوروں پر لازم ہوتا تھا کہ وہ جونہی کام سے فارغ ہوں بلا تاخیر کھیتوں سے نکل کر اپنی جھونپڑیوں میں چلے جائیں، جو گوروں کی آبادی سے دُور نشیبی جگہوں میں بنی ہوئی ہوتی تھیں۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب: "احرارِ کینیا — ماؤ ماؤ کی بغاوت" مطبوعہ مصر)

امریکہ میں نیگرو باشندوں کی حالتِ زار | امریکہ کے حالات اس سے بھی زیادہ بدتر اور المناک ہیں۔

ایک طرف تو امریکہ کے دارالحکومت نیویارک میں نصب شدہ مجسمہ آزادی کے نیچے یہ عبارت کندہ ہے:
"تم اپنے خستہ و کوفتہ اور بدحال عوام کو میرے سپرد کرو جو آزادی کا سانس لینے کے لیے تڑپ رہے ہیں اپنی
اس پر رونق بندرگاہ میں میرے پاس ان لوگوں کو بھیج دو جن کی کوئی جائے پناہ نہیں اور جن کا کوئی وطن نہیں"
لیکن اس علمبردار حریت ملک میں سیاہ فام افراد کے ساتھ جو بدترین سلوک کیا جارہا ہے اسے ہم خود بیان
کرنے کے بجائے خود انہی کے ایک سرکردہ فرد کی زبان سے نقل کرتے ہیں! امریکی سینیٹ کا معزز ممبر جیمس لکھتا ہے:

"کسی سیاہ فام کے لیے، جو اپنے دل میں سیاسی مساوات کی آرزو رکھتا ہے امریکہ کی
جنوبی ریاستوں میں کاروبار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ ملک صرف سفید فام کی
ملکیت ہے۔ اور اسے اس کی ملکیت میں رہنا چاہیے۔"

تقریباً ہر میدان میں نیگرو فام سفید فاموں کے پنجہ تشدد میں گرفتار ہیں۔ مثلاً تعلیمی و ثقافتی میدان میں
نیگرو نسل کا حال یہ ہے کہ امریکہ کی ۲۰ ریاستیں ایسی ہیں جن میں کسی کالے رنگ والے کو سفید رنگ والوں کے
ساتھ ایک ہی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں۔ ریاست میسیپی (MISSISSIPI) کے
دستور میں دفعہ ۲۰۷ کے تحت درج ہے: "تعلیم و ثقافت کے میدان میں اس امر کا خاص خیال رکھا جائے گا کہ سفید
رنگ والوں کے بچے نیگرو بچوں سے جدا رکھے جائیں اور دونوں طبقوں کے لیے جداگانہ تعلیم گاہیں ہوں۔" فلوریڈا اسٹیٹ
کے قانون میں متعدد ایسی دفعات ملتی ہیں جن کا منشا یہ ہے کہ سیاہ فام طلباء کی کتب نصاب سفید فام طلباء
کی کتابوں سے الگ ہوں گی۔"

شادی بیاہ کے معاملے میں بھی تقریباً تمام ولایات متحدہ میں یہ پابندی ہے کہ کوئی سفید فام عورت
کسی سیاہ فام مرد سے یا سفید فام مرد سیاہ فام عورت سے تعلق زن و شو قائم نہیں کرسکتا اور بعض ریاستوں
میں۔ مثلاً ریاست میسیپی میں۔ از روئے دستور اس طرح کی شادیاں سرے سے ناجائز ہیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر
یہ کہ ہر اُس کالے مرد یا عورت کے ساتھ سفید مرد یا عورت کا تعلق ازدواجی باطل ہے جس کی رگوں میں
جاری ہونے والے خون کا آٹھواں حصہ بھی زنگی خون کا ہو۔

کاروبار اور ملازمتوں کے اندر بھی یہی افسوسناک روش پائی جاتی ہے۔ متعدد ریاستوں کا قانون کاروبار

اور فیکٹریوں میں نیگرو ملازموں اور مزدوروں کو گورے ملازموں اور مزدوروں کے دوش بدوش کام کرنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ یہاں تک پابندیاں ہیں کہ جن دروازوں سے گوروں کی آمد و رفت ہو اُن سے نیگرو آمد و رفت کے مجاز نہیں ہیں۔

معاشرتی اور اجتماعی میدان میں اگر دیکھا جائے تو وہاں یہ تشدد اور بہیمیت مزید و آتشہ ہو جاتی ہے مثلاً ۱۴ امریکی ریاستوں میں از روئے قانون ٹرینوں میں کالے مسافروں کو سفید مسافروں سے علیحدہ رکھا جاتا ہے، بلکہ ٹرینوں میں کالے مسافروں کے لیے مخصوص کمپارٹمنٹ ہیں۔ وہ صرف انہی میں سفر کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ٹراموں میں، ٹیلیفون کے کمروں میں، ہسپتالوں میں کالوں کے لیے الگ نشستیں ہیں حتیٰ کہ دماغی امراض کے شفاخانوں میں سفید فام پاگلوں اور سیاہ فام پاگلوں کے درمیان امتیاز برتا جاتا ہے۔ سب سے مضحکہ خیز یہ واقعہ ہے کہ واشنگٹن میں کتوں کے ایک قبرستان کے متولی نے ۱۹۴۷ء میں یہ نوٹس جاری کیا کہ اس قبرستان میں ایسے کتوں کو دفن کرنے کی درخواست قبول نہیں کی جائے گی جن کے مالک نیگرو ہوں گے۔ اس نوٹس کی وجہ اُس نے یہ بیان کی کہ اگرچہ اسے یہ معلوم ہے کہ کتے ایک ہی قبرستان میں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو دفن ہونے میں کوئی عار نہیں سمجھتے لیکن اُسے پتہ چلا ہے کہ کتوں کے سفید مالک اس بات سے سخت برافروختہ ہیں کہ ان کے ناز پروردہ کتوں کے ساتھ مرنے کے بعد یہ بدسلوکی کی جائے یعنی سیاہ فام باشندوں کے کتوں کے مساوی درجہ دیا جائے۔"

شمالی امریکہ کے شہروں میں سیاہ فام کا مقام | امریکی اربابِ سیاست اس شرمناک انسانی تذلیل پر اکثر یہ کہہ کر پردہ پوشی کرتے رہتے ہیں کہ مہذب امریکی ریاستوں — یعنی شمالی ریاستوں — میں یہ صورتِ حال نہیں، بلکہ منافرت و کراہیت کا زیادہ زور جنوبی علاقوں میں ہے۔ لیکن واقعات ان عذرات کی صاف تردید کرتے ہیں، شمالی امریکہ کے تمام بڑے بڑے شہروں میں سیاہ فام آبادیاں غلیظ اور متعفن محلوں اور بستیوں میں محصور ہیں جہاں ان کے لکڑی کے بنے ہوئے مکانات بوسیدگی کی وجہ سے ہر وقت پیوند زمین ہونے کے لیے منتظر رہتے ہیں۔ چوہوں اور کیڑے مکوڑوں کی فوجیں اِدھر اُدھر بھاگتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ آگ کے شعلے ہر روز کسی نہ کسی مکان کو اپنی لپیٹ میں لیتے رہتے ہیں۔ نیویارک کی ہارلم اسٹریٹ جو نیگرو اسٹریٹ کہلاتی ہے — کا ایک ایک کمرہ ۱۷ اور ۱۸ افراد پر مشتمل ہے۔ ایک بار ایک امریکی جریدے نے اسی اسٹریٹ کے بارے میں لکھا تھا کہ "اگر ہم ہارلم اسٹریٹ کی گنجان اور تہ بہ تہ آبادی کے انداز کو ایک

اصول فرض کریں اور اُسے ولایاتِ متحدہ کے تمام باشندگان پر منطبق کریں تو ہم بآسانی پورے امریکہ کی آبادی کو نیویارک کے نصف رقبے میں کھپا سکتے ہیں۔ واشنگٹن میں وہائٹ ہاؤس کے سامنے اور ابراہام لنکولن کے اسٹیچو کے زیرِ سایہ ایک ایسا محلہ موجود ہے جس میں ۲½ لاکھ سیاہ فام نفوس آباد ہیں، یعنی تقریباً واشنگٹن کی کل آبادی کا چوتھا حصہ ہیں۔ لیکن اُن کی زیست میں اور اصطبل کے گھوڑوں کی زیست میں کوئی فرق نہیں ہے۔

معاشرتی اچھوت واشنگٹن ہی میں اس امرِ واقعہ کا مشاہدہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ کوئی نیگرو سفید فام امریکیوں کے مخصوص ریستورانوں اور ہوٹلوں میں، تھیئٹروں میں، اسکولوں اور کالجوں میں اور شفاخانوں حتیٰ کہ کلیساؤں میں بھی داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ایک بار پاناما ری پبلک کا ایک نیگرو واشنگٹن کے کیتھولک گرجا میں داخل ہو گیا۔ وہ اپنی دعا و عبادت میں منہمک تھا کہ ایک پادری تیزی کے ساتھ آیا اور اُس کے ہاتھ میں ایک چٹ دے دی جس میں ایک ایسے کیتھولک گرجا کا پتہ درج تھا جو نیگروں کے لیے مخصوص تھا۔ پادری صاحب سے جب اس اخراج کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ جب شہر میں سیاہ فام کیتھولک کے لیے الگ کلیسا موجود ہیں تو یہ سیاہ فام وہاں جا کر اپنے رب کی عبادت کر سکتا ہے۔" یہ ان پادریوں کی ذہنیت کا حال ہے جو دنیا بھر کے سامنے یہ ڈھنڈورا پیٹتے نہیں تھکتے کہ حضرت یسوع مسیح تمام انسانیت کے نجات دہندہ ہیں۔ (مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو کتاب: "دورِ جدید میں جمہوریت کا جنازہ" مطبوعہ مصر)۔

امریکی سیاستدانوں کا اعتراف سیاہ فام آبادیوں کا ماحول بیماری، جہالت اور پسماندگی کے کیا رنگ ڈھنگ رکھتا ہے، اس کا اندازہ "امریکن ادارۂ تعلیم و ثقافت" کی ایک شائع شدہ رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ رپورٹ پروفیسر براؤن نے ولایاتِ متحدہ کے اکثر حصوں کا دورہ کر کے نیگرو آبادیوں کی معاشرت کا جائزہ لینے کے بعد پیش کی ہے۔ پروفیسر موصوف کا بیان ہے:

> "سڑکوں کی پختگی، راستوں کی روشنی، گندے پانی کی پائپ لائنوں کی حدود اور پولیس کے فرائض کا نقطۂ انتہا وہ ہوتا ہے جہاں سے شہر کی سیاہ فام آبادی کا آغاز ہوتا ہے۔ اکثر علاقوں میں کوئی ایسا ہسپتال موجود نہیں جس کا دروازہ کالے شخص کے لیے وا ہو سکتا ہو۔ رہی طبی اور نرسنگ سروسز تو یا تو وہ سرے سے مفقود ہیں یا اگر ہیں تو بالکل ناکافی۔ رپورٹ میں سیاہ فام

آبادیوں میں پبلک ہیلتھ کا تناسب بھی اعداد و شمار کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔ چنانچہ بتایا گیا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں شکاگو اور نیویارک میں سیاہ فام شہریوں میں مرضِ سل کا تناسب سفید فام شہریوں سے ۵ گنا زیادہ تھا۔ نیویارک اور نیوجرسی میں یہ تناسب ۷ گنا زیادہ تھا۔ وضعِ حمل میں مرنے والی سیاہ فام عورتوں کی شرح اموات سفید فام عورتوں کی شرح اموات سے دو گنا تھی۔ جبکہ نیگرو بچوں کی شرح اموات امریکی بچوں کی شرح اموات سے ۷۰ فیصد زیادہ تھی۔ اسی طرح رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ امریکن نیگرو کی اوسط عمر امریکن سفید فام کی اوسط عمر سے پورے دس سال کم ہوتی ہے۔"

یہ ہے وہ رسوا کن اور انسانیت سوز ماحول جس میں امریکہ کے ۵ ملین سیاہ فام، جو کل آبادی کا دسواں حصہ بنتے ہیں، زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس کے بعد اب امریکی علمبردارانِ تہذیب کا کیا منہ رہ جاتا ہے کہ وہ بین الاقوامی پلیٹ فارم پر آکر گلا پھاڑ پھاڑ کر یہ کہیں کہ وہ آزاد دنیا کے ہر شعبۂ امن و سلامتی کے علمبردار ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر ہم امریکی مصنف ہارے ہائیوڈ کی کتاب: "آزادی تنزح" کا بھی ایک اقتباس نقل کر دیں تاکہ امریکہ کے دعوٰی حریت کی حقیقت بھی گھر کے بھیدی کے ہاتھوں طشت از بام ہو جائے

"اس میں کوئی شک نہیں کہ جنوبی افریقہ کے ماسوا کسی ملک نے غلامی کو قومی تشدد کا ذریعہ اختیار نہیں کیا۔ جیسا کہ امریکہ میں اختیار کیا گیا ہے۔ اگرچہ غلامی کی وہ صورت تو ختم ہو چکی ہے جس میں غلاموں کو دوسری اشیاء کی طرح مملوکہ شئے سمجھا جاتا تھا، لیکن طبقاتی اور اچھوت نظام کی حیثیت سے ابھی یہ پورے عروج پر ہے اور جس کا مقصد یہ ہے کہ جو پوزیشن سفید فام کو حاصل ہے، سیاہ فام کو اس سے فروتر رکھا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مختلف وسائل اختیار کیے جاتے ہیں۔ کبھی دیوانوں اور آشفتہ سر لوگوں کے بہکانے پر سیاہ فام نسل کے خاندان کے خاندان تلوار کے گھاٹ اتار دیے جاتے ہیں، اور ذمہ دار حکام منقار زیر پر بیٹھے ہیں یا کبھی ایسے ظالمانہ قوانین صادر کر دیے جاتے ہیں جن کا مقصد سیاہ فام نسل کا قومی وجود

معدوم کر دینا ہوتا ہے اور کبھی عادات و رسوم کی آڑ میں سیاہ فام نسل کو انتقام کی بھٹی میں جھونک دیا جاتا ہے۔"

امریکی ماہر اقتصادیات فکٹر پرلو رقمطراز ہے:۔

"اس امر میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ امریکی خانہ جنگی کے دور میں شمالی حصوں کے جو صنعت کار فیڈرل حکومت پر چھا گئے تھے، وہ سیاہ فام اقوام کو آزادی دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کی اصل کوشش یہ تھی کہ وہ سیاہ فام اقوام کو اپنی اغراض کی خاطر استعمال کرنے کے لیے ان کے جنوبی آقاؤں کی جگہ خود آقائی کی مسند پر متصرف ہو جائیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ری پبلکن پارٹی اور جنوبی ریاستوں کی افواج جس پالیسی پر گامزن تھی وہ دراصل ایک پیکٹ کے تحت تھی جو سابق آقاؤں کے ساتھ طے کیا گیا تھا اور جس کا منشا سیاہ فام نسل کے گلے میں ایک نئے طوقِ غلامی کو ڈالنا تھا۔" موصوف آگے چل کر لکھتا ہے کہ "ملک کے طول و عرض میں خونی اور نسلی عصبیت کا زہر پھیل چکا ہے۔ اور امریکی زندگی کی رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے۔ اب امریکی قوم سیاہ فام باشندوں اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ گفتگو کرنے یا ان کی طرف اشارے کنائے کرنے کے لیے ایسے نازیبا الفاظ و کلمات وضع کرنے کی عادی ہو گئی ہے جو نہ صرف استخفاف و تحقیر سے لبریز ہوتے ہیں بلکہ شرافت سے بھی عاری ہوتے ہیں۔"

سیاہ فام ہونے کی سزا ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے کہ کولمبیا میں ایک نیگرو نوجوان اپنی ماں کے ساتھ ایک ریڈیو مکینک کے پاس گیا، ان کے پاس ایک مرمت طلب ریڈیو سیٹ تھا جسے وہ مذکورہ ریڈیو مکینک سے منہ مانگی اجرت کے عوض پہلے بھی مرمت کروا چکے تھے۔ لیکن وہ بدستور خراب تھا۔ نیگرو عورت نے ریڈیو مکینک سے کہا: "۱۲ ڈالر ادا کرنے کے بعد بھی ریڈیو کا گونگا پن دور نہیں ہوا؟" ریڈیو مکینک نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً ان کو نکل جانے کا حکم دے دیا۔ دکان کے ملازم نے اٹھ کر نیگرو عورت کی لاتوں سے ایسی تواضع کی کہ بچاری منہ کے بل گر پڑی۔ نیگرو نوجوان کو ماں کی اس توہین پر سخت غصہ آیا اُس نے ملازم کے ایک گھونسا رسید کیا اور وہ لڑھکتا ہوا دکان کے باہر جا پڑا۔ اتنے میں ہمسایہ دکاندار نے یہ دیکھ کر شور مچا دیا کہ "پکڑ لو، اس بدکار کے بچے کو"۔ چنانچہ آناً فاناً لوگ جمع ہو گئے

اور چلا چلا کر کہنے لگے کہ "ہم ان دونوں سے انتقام لے کر چھوڑیں گے۔" امریکنوں کے نزدیک انتقام لینے کی نوعیت یہ ہے کہ کسی عدالتی کارروائی کے بغیر سیاہ فام کا سر دھڑ سے جُدا کر دیا جائے۔ بالآخر بعض لوگوں کے بیچ بچاؤ سے اس وقت نیگرو ماں بیٹے کو وہاں سے نکال کر جیل میں بھیج دیا گیا۔ لیکن عوام کا جوشِ انتقام اس سے سرد نہ ہوا۔ بلکہ وہ نیگرو باشندوں کے محلے پر پل پڑے اور پولیس کی حفاظت کے باوجود فائرنگ اور آتش زدگی کے متعدد واقعات رونما ہو گئے جن میں متعدد سیاہ فام موت کے منہ میں آ گئے اور ایک خاصی تعداد زخمی ہو گئی۔"

سیاہ فام لونڈی اور عمر بن عبدالعزیزؒ | اب اسلامی تہذیب کی ایک مثال بھی ملاحظہ فرمائیں :۔

پہلی صدی ہجری ۔۔۔ یعنی ۱۳ سو سال قبل ۔۔ کا واقعہ ہے۔ مصر کی ایک فرتونہ نامی حبشی لونڈی کی طرف سے امیر المومنین عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس فریاد آئی کہ اس کے گھر کی بیرونی دیواریں پست ہیں جس کی وجہ سے اس کی مرغیاں چوری ہوتی رہتی ہیں۔ امیر المومنین نے اُسے پیغام بھیجا کہ میں نے مصر کے گورنر کو حکم دے دیا ہے کہ تمہاری دیوار کو درست کر دے اور تمہارے مکان کو مزید محفوظ کر دے۔ ادھر مصر کے گورنر ایوب بن شرحبیل کے نام یہ فرمان لکھا: "فرتونہ نے مجھے لکھا ہے کہ اس کی چار دیواری چھوٹی ہے جس کی وجہ سے اس کی مرغیاں چوری ہو جاتی ہیں۔ فرتونہ نے دیوار کو مضبوط اور اونچا کرنے کی درخواست کی ہے۔ میرے اس فرمان کو وصول کرتے ہی تو بذاتِ خود فرتونہ کے مکان پر جا اور اس تمام کارروائی کو سر انجام دے۔" ایوب بن شرحبیل کو جب امیر المومنین کا مکتوب ملا، وہ فوراً انتقام جیزہ کی طرف روانہ ہوا اور فرتونہ نامی لونڈی کا مکان تلاش کرنے لگا۔ چنانچہ سعیِ بسیار کے بعد جب اُسے مکان ملا تو دیکھا کہ ایک سیاہ رو اور بدحال عورت بیٹھی ہوئی ہے۔ اس نے فرتونہ کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا اور اپنی موجودگی میں اس کی دیوار کو بنوایا۔ یہ ہیں اسلامی تہذیب کے خد و خال ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است